



ہندوی سے اردو تک: اردو کے تاریخی ناموں کے لسانی اور ارتقائی عوامل کا تحلیلی جائزہ

FROM HINDAVI TO URDU: AN ANALYTICAL STUDY OF THE LINGUISTIC AND EVOLUTIONARY FACTORS BEHIND THE HISTORICAL NAMES OF THE URDU LANGUAGE

Sidra Rafiq

The Superior University, Lahore

Professor Dr. Faisal Kamal Haidri

Urdu Department, The Superior University, Lahore

Muhammad Uzair Shafiq

Research Scholar MS Urdu Department, The Superior University, Lahore.

Email: srteacher604@gmail.com

Abstract:

This research paper presents a comprehensive and analytical exploration of the evolutionary trajectory of the Urdu language, tracing its historical transitions through various nomenclature from Hindavi to Urdu. Language is an organic entity that does not emerge overnight through royal decrees; rather, it is the byproduct of centuries of socio-cultural synthesis. This study highlights how the shifting names of Urdu—including Hindavi, Hindi, Dehlavi, Gujri, Dakhni, Rekhta, and ultimately Urdu—are not mere semantic labels but distinct markers of its geographical, political, and sociological journey across the Indian subcontinent.

The central thesis argues that Urdu's journey represents a transition from a raw, colloquial lingua franca of the masses to a highly sophisticated courtly and literary language. Drawing upon rigorous linguistic and textual evidence, the paper examines the formative contributions of Sufi saints and early literary giants, most notably Amir Khusrau, in bridging Persian prosody with indigenous vernaculars. Furthermore, the paper evaluates the critical scholarship of Hafiz Mahmood Shiranvi regarding the Turkish origin of the word 'Urdu' (meaning army or camp) and counter-balances it with the alternative linguistic paradigms proposed by scholars like Allama I. I. Kazi, who links its roots to Indo-European origins. Ultimately, the study concludes that Urdu's enduring strength lies in its unparalleled linguistic assimilation and resilience, maintaining its core cultural identity while gracefully absorbing diverse civilizational influences.

Keywords:

Urdu Language Evolution, Hindavi to Urdu, Historical Nomenclature, Socio-Linguistic Synthesis, Rekhta, Hafiz Mahmood Shiranvi, Allama I. I. Kazi, Ganga-Jamuni Culture

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ زبانیں کسی بند کمرے میں بیٹھ کر یا راتوں رات تخلیق نہیں کی جاتیں، اور نہ ہی یہ کسی شاہی فرمان یا اچانک رونما ہونے والے واقعے کا نتیجہ ہوتی ہیں، بلکہ یہ صدیوں کے اس گہرے تہذیبی، سماجی اور ثقافتی ملاپ کا ثمر ہوتی ہیں جہاں مختلف نسلیں، رنگ، ثقافتیں اور بولیاں بولنے والے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں، جس کے نتیجے میں پرانے لسانی سانچے ٹوٹے پھوٹے ہیں اور ایک بالکل نئی، پک اور دار اور ہمہ گیر زبان کی بنیاد پڑتی ہے۔ زبان اردو کی تاریخ کا مطالعہ اس لسانی اور ثقافتی ارتقا کو سمجھنے کے لیے بے حد اہم ہے، کیونکہ اس کے مختلف ادوار میں سامنے آنے والے نام—جیسے ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی، ریختہ اور بالآخر 'اردو'—محض الفاظ کا مجموعہ یا محض نام نہیں ہیں، بلکہ یہ اس زبان کے جغرافیائی سفر، سیاسی اتار چڑھاؤ، اور سماجی تبدیلیوں کی مکمل اور مفصل داستان ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح اس زبان نے مختلف علاقوں، درباروں اور خانقاہوں میں سفر کرتے ہوئے برصغیر کی مشترکہ "گنگا جمنی تہذیب" کو اپنے اندر سمویا۔ اس پورے لسانی سفر کا مرکزی خیال دراصل "لسانی اچھوت پن سے نفاست" اور



”ایک عام عوامی بولی سے درباری وادبی زبان“ بننے کی ایک نہایت سحر انگیز اور طویل داستان ہے؛ جہاں اپنے ابتدائی دور میں مقامی پراکرتوں اور اپبھرنشوں کے ساتھ عرب، ایرانی اور ترک فاتحین، تاجروں اور صوفیوں کی زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کے ملاپ سے جنم لینے والی اس بولی کو ’ہندوی‘ کہا گیا، جسے علمی اور درباری اثر افیہ کے حلقوں میں نفاست اور علمی گہرائی سے عاری ایک کھردری، عام اور اچھوت سی عوامی زبان سمجھا جاتا تھا۔ تاہم، صوفیائے کرام کے اخلاص، درویشوں کی تبلیغی مساعی اور وقت کی شدید ضرورت نے اس زبان کو عوامی رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ (Lingua Franca) بنا دیا، جس کے باعث اس نے اپنے دامن میں مختلف زبانوں کے الفاظ کو اس خوبصورتی اور سلاست سے جذب کیا کہ اس کا ابتدائی کھردرا پن دور ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ ایک بے پناہ نفاست، چاشنی، شیرینی اور وسعت نے لے لی۔ یوں، جو زبان کبھی صرف گلی کوچوں، لشکری کیمپوں اور بازاروں تک محدود تھی، وہ وقت کے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی رفتہ رفتہ شاہی درباروں (اردوئے معلیٰ) کی زینت بنی اور امیر خسرو کی ابتدائی پہیلیوں، گیتوں اور کمرنیوں سے اپنا ادبی سفر شروع کر کے، ولی دکنی کی غزلوں سے نکھرتی ہوئی، بالآخر میر، سودا، ذوق اور غالب کے دیوان تک پہنچ کر برصغیر کی بلند ترین علمی، ادبی، نثری اور شعری روایت کی معتبر ترین علامت بن کر ابھری۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے (1)

داغ دہلوی نے جس ’اردو‘ پر ناز کیا ہے وہ ہمیشہ سے اس نام سے نہیں جانی جاتی تھی، بلکہ مختلف ادوار میں اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ سب سے پہلے ہندوستان کی نسبت سے اسے ’ہندوی‘ کہا گیا۔ حافظ محمود شیرانی سے لے کر ڈاکٹر سنیستی مکار چڑجی تک، تمام لسانی محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اس زبان کا سب سے قدیم نام ہندوی ہے۔ قدیم لغات اور ادبی تصنیفات میں بھی اس کا نام ’ہندی‘ یا ’ہندوی‘ ملتا ہے۔ اسی لیے ۸۱۲ھ میں ’قاضی خاں بدر‘ سے لے کر ۱۷۴۲ء میں ’سراج الدین خاں آرزو‘ تک، سبھی قدیم لغات نویسوں نے ہندوستان کی اس زبان کو ’ہندی‘ یا ’ہندوی‘ ہی لکھا ہے۔

بعض صوفیائے کرام کی تحریروں اور اقوال میں بھی اسے ’ہندی‘ یا ’ہندوی‘ کہا گیا ہے۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی (وفات: ۷۵۲ھ)، شرف الدین یحییٰ منیری (وفات: ۷۷۲ھ) اور اشرف جہانگیر سمنانی (وفات: ۸۰۸ھ) وغیرہ نے اپنی گفت گو اور تحاریر میں ’ہندی‘ یا ’ہندوی‘ کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ اس لسانی سفر کی وضاحت کرتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

”جس زبان کو آج ہم اردو کہتے ہیں، پرانے زمانے میں اسی زبان کو ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ کہا گیا۔ اور یہ نام تقریباً اسی ترتیب سے استعمال میں آئے جس

ترتیب سے میں نے انہیں درج کیا ہے۔“ (2)

میراث (پیدائش: ۱۷۵۸ء / ۱۷۵۹ء - وفات: ۱۷۹۳ء) نے اپنی مثنوی ’نواب و خیال‘ کی ابتدا میں اپنی زبان کو ’ہندوی‘ قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

فارسی سو ہیں، ہندوی سو ہیں

باقی اشعار مثنوی سو ہیں (3)

اس عہد کے دیگر صوفیائے کرام کی ادبی تصانیف میں بھی ’ہندی‘ یا ’ہندوی‘ کا ہی استعمال ہوا ہے۔ شاہ میراں جی شمس العشاق (وفات: ۱۳۹۶ء)، شاہ بہان الدین خانم (وفات: ۱۵۸۲ء) اور جعفر زٹلی (۱۶۵۷ء - ۱۷۱۳ء) کے ساتھ ہی عبدال بیجا پوری کی کتاب ’ابراہیم نامہ‘ (۱۶۰۳ء)، ملا وجہی کی ’سب رس‘ (۱۶۳۵ء)، اور فضل کی ’دہ مجلس‘ (۱۷۲۳ء) وغیرہ سب میں اس زبان کا نام ’ہندوی‘ یا ’ہندی‘ درج ہے۔

’ہندوی‘ کے بعد اس زبان کے ارتقائی سفر میں جو دوسرا سب سے اہم، معتبر اور مقبول نام سامنے آتا ہے، وہ ’ریختہ‘ ہے۔ لسانی اور لغوی اعتبار سے لفظ ’ریختہ‘ اپنے اندر معانی کی ایک وسیع کائنات اور گہری معنویت رکھتا ہے۔ لغت میں اس کے متعدد اور متنوع معنی ملتے ہیں؛ مثلاً کسی چیز کو نئے سانچے میں ڈھالنا، بنانا، ایجاد و اختراع کرنا، صوتی و لفظی اعتبار سے موزوں کرنا، یا پھر کسی پریشان، بکھری ہوئی اور گری پڑی چیز کو یکجا کرنا۔ اپنے لغوی پس منظر کے عمیق مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ نام اس زبان کے مزاج اور



اس کے تشکیلی دور کی کامل عکاسی کرتا ہے۔ جب برصغیر کے مقامی لسانی تانے بانے میں عربی، فارسی اور ترکی جیسی مقتدر زبانوں کے دھاگے پروئے گئے، تو گویا ایک نیا پائیدار کپڑا بنا گیا؛ اور جب مختلف زبانوں کے بکھرے ہوئے (پریشان) عناصر کو ملا کر ایک بالکل نیا سانچہ ڈھالا گیا، تو تخلیق زبان کا یہ سحر انگیز عمل لغت کے انہی معانی کا متبادل ٹھہرا۔ چنانچہ، یہ زبان اپنے ابتدائی دور کی کھر دراہنگی اور اچھوت پن سے نکل کر جب شعری وادبی نفاست کے سانچے میں ڈھلنے لگی، تو اسے رینختہ کا نام دیا گیا، جو محض ایک نام نہیں بلکہ اس امر کا اعتراف تھا کہ ایک نئی اور اچھوتی لسانی اختراع وجود میں آچکی ہے۔۔۔ مولانا محمد حسین آزاد ’آب حیات‘ میں لکھتے ہیں:

”مختلف زبانوں نے اسے رینختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ رینختہ کے معنی ہیں گری، پڑی، پریشان چیز۔“ (4)

لیکن شروعات میں رینختہ کا استعمال بالکل الگ معنوں میں ہوا تھا، یعنی مقامی راگوں اور فارسی کو ملا کر ہندوستانی موسیقی میں جو نئی اختراع وجود میں آئی، اسے رینختہ کہا گیا۔ اسی لیے مختلف زبانوں اور بولیوں کے امتزاج کی بنا پر استعارہً یہ زبان بھی رینختہ کہلائی۔

لسانی تاریخ کے تناظر میں یہ بات خاصی اہمیت کی حامل ہے کہ زبان کے لیے رینختہ کا لفظ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے عہد حکومت (1556ء تا 1605ء) میں غالباً پہلی بار استعمال ہوا، تاہم اس دور میں اس کا دائرہ کار عام بول چال کی زبان کے بجائے صرف اور صرف منظوم کلام یعنی شاعری تک ہی محدود رہا۔ اس کے برعکس، روزمرہ کی گفتگو، عوامی رابطے اور ابتدائی نثری کاوشوں کے لیے بدستور ’ہندی‘ یا ’ہندوی‘ کا لفظ ہی مستعمل رہا، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رینختہ ابتدا میں کوئی الگ زبان نہیں بلکہ ایک خاص شعری اسلوب (Poetic Style) کا نام تھا۔

اس زبان کو شاعری کے لیے رینختہ (جس کا ایک لغوی معنی ”ملا جلا“ یا ”مخلوط“ بھی ہے) کہنے کی بنیادی وجہ موسیقی اور راگ راگنیوں کا وہ فنی تقاضا تھا، جس کے تحت اس عہد کے شعر انے فارسی اور مقامی ہندوی بولیوں کا ایک نہایت پر لطف، شیریں اور آہنگ دار امتزاج پیدا کیا۔ اس اسلوب میں غزل کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا ہندوی میں ہوتا، یا ایک ہی مصرعے کے اندر دونوں زبانوں کے الفاظ کو اس طرح پرویا جاتا جیسے اینٹوں کے درمیان گارا (رینختہ) لگا کر دیوار اٹھائی جاتی ہے۔

اگرچہ اکبر کے عہد میں اسے باقاعدہ نام ملا، لیکن اس مخلوط شعری روایت کی بنیادیں بہت پہلے ہی رکھی جا چکی تھیں اور اس سلسلے میں حضرت امیر خسرو (1253ء تا 1325ء) نے اپنے لافانی اور اچھوتے لسانی تجربات کی بدولت خصوصی و آفاقی شہرت پائی۔ امیر خسرو نے موسیقی کی گہری سمجھ بوجھ کا استعمال کرتے ہوئے فارسی، بھوج اور مقامی راگوں کے ملاپ سے جو کلام تخلیق کیا (جیسے ان کی مشہور زمانہ غزل: ”زحال مسکین مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں“) (، وہ دراصل اسی رینختہ کی ابتدائی، جاندار اور سب سے مقبول تاریخی شکل تھی، جس نے آگے چل کر دی دکنی، میر اور غالب کے عہد تک پہنچتے پہنچتے پوری زبان کو اپنے نام کے سحر میں جکڑ لیا۔ ان کا ایک مشہور ہندوی دوہا یہ ہے:

گوری سووے تیج پہ اور کھ پہ ڈارے کیس

چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھی چھو دیس

اور ان کی یہ ملمع غزل (فارسی اور ہندوی کا آمیزہ) تو زبان زد عام ہے:

زحال مسکین مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تاپ ہجران ندرام اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبان ہجران دراز چوں زلف وروز ووصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

بخت روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں



امیر خسرو کے بعد شیخ سعدی نے بھی ریختہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ مصحفی کے عہد تک ہندی، اور ریختہ، دونوں الفاظ اردو شاعری کے لیے مستعمل تھے۔ چنانچہ مصحفی کہتے ہیں:

مصحفی فارسی کو طاق پر رکھ

اب ہے اشعار ہندی کا رواج

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا

بو آتی ہے اس میں فارسی کی (5)

یوں تو ریختہ کی اصطلاح شروع میں ایک خاص قسم کی آئینہ شاعری کے لیے مستعمل تھی، لیکن کچھ عرصے بعد یہ لفظ تمام شاعری کے لیے مقبول ہو گیا۔ شاہ حاتم، قائم چاند پوری، مرزا قتل، میر تقی میر، مرزا سودا، مصحفی، میر سوز اور جرأت سے لے کر مرزا غالب کے وقت تک سبھی کے کلام میں یہ لفظ ملتا ہے اور سبھی نے اسے شاعری کا مترادف جانا۔ بقول غالب:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا (6)

میر تقی میر نے اپنے تذکرے 'نکات الشعرا' میں لکھا ہے:

”معلوم ہو کہ ریختہ کئی قسم کا ہوتا ہے۔ ان تمام میں جو کچھ فقیر کو معلوم ہے وہ لکھا جا رہا ہے۔ پہلا وہ کہ اس کا ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی دوسرا وہ کہ اس کا آدھا مصرع ہندی اور آدھا فارسی تیسرا وہ جس میں فارسی کے فعل استعمال کیے جاتے ہیں اور یہ فحش ہے۔“ (7)

دلی دکنی اور سراج اور گنگ آبادی سے لے کر میر تقی میر کے عہد تک ریختہ کا لفظ شاعری کے لیے ایک مخصوص انداز میں مقبول ہو چکا تھا۔ بقول دلی:

دلی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے

سنے تب اس کو جان و دل سے حسانِ عجم آکر (8)

اس زمانے تک عام بول چال کی زبان کے لیے ہندی کا لفظ اور مخصوص شاعری کے لیے ریختہ کا لفظ استعمال ہوتا رہا۔ شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

”شمال میں ریختہ اور ہندی، ہماری زبان کے نام کی حیثیت سے یکساں مقبول تھے۔ یہ حالت اٹھارویں صدی تک رہی۔ وسط انیسویں صدی سے زبان کے نام کی حیثیت سے ہندی کو ریختہ پر ترجیح دی جانے لگی۔ بلکہ یہ کہا جانے لگا کہ غلط نہ ہو گا کہ انیسویں صدی میں بول چال کی زبان کو تقریباً ہمیشہ ہندی ہی کہا جاتا تھا، جب کہ اٹھارویں صدی میں ریختہ کو بول چال کی زبان کے لیے بے تکلف استعمال کرتے تھے۔“ (9)

ہندی، ہندی اور ریختہ کے طویل تاریخی اور لسانی سفر کے بعد، ہماری زبان کے لیے بالآخر مستقل اور مستقل بالذات طور پر لفظ 'اردو' کا استعمال شروع ہوا، جس نے سابقہ تمام ناموں کو پس منظر میں دھکیل کر اس زبان کو اس کا ابدی تشخص عطا کیا۔ لسانیاتی تحقیق کی رو سے 'اردو' بنیادی طور پر ترکی زبان کا لفظ ہے، جو مختلف لہجوں اور ادوار میں 'اوردا'، 'اردو' اور 'اوردا' کی شکلوں میں مستعمل رہا ہے اور لغت میں اس کے بنیادی معنی 'لشکر'، 'چھاوٹی'، 'شاہی خیمہ' یا 'بادشاہ کے رہنے کی جگہ' (قصر سلطانی) کے ہیں۔ برصغیر میں مغلوں کی آمد کے بعد، جب دہلی کے لال قلعے اور اس کے مضافات میں شاہی لشکر، دیسی و پردیسی سپاہیوں، تاجروں اور مقامی عوام کا وسیع پیمانے پر ملاپ ہوا، تو اس لشکر کی اپنی ایک مخصوص مخلوط زبان وجود میں آئی، جسے ابتداً زبان اردوئے معلیٰ (شریفوں یا بادشاہ کے لشکر کی زبان) کہا گیا اور رفتہ رفتہ اختصار کے اصول کے تحت 'معلیٰ' اور 'زبان' کے الفاظ حذف ہو گئے اور صرف 'اردو' اس زبان کا مستقل نام بٹھرا۔

لفظ 'اردو' کی اس تاریخی تشریح اور اس کے لسانی سفر کو محض ایک عمومی مفروضے کے بجائے ٹھوس علمی اور دستاویزی بنیادوں پر رکھنے کا سہرا برصغیر کے مایہ ناز محقق حافظ محمود شیرانی کے سر جاتا ہے۔ شیرانی صاحب نے اپنی معرکہ الآرا کتاب "پنجاب میں اردو" اور دیگر تحقیقی مقالات کے ذریعے لفظ 'اردو' کی تحقیق کا دائرہ انتہائی وسیع اور عمیق کر دیا۔ انہوں نے محض زبانی روایات پر انحصار کرنے کے بجائے تاریخی متون، تُوذکِ بابری، اکبر نامہ، جہانگیر اور دیگر فارسی تواریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور یہ ثابت کیا کہ لفظ



اردو برصغیر میں زبان کے معنوں میں استعمال ہونے سے بہت پہلے سے بطور لشکر یا شاہی کیپ استعمال تھا۔ انہوں نے تعلق، لودھی اور مغل عہد کے لسانی شواہد سے واضح کیا کہ کس طرح یہ لفظ ایک جغرافیائی اور عسکری اصطلاح سے سفر کرتا ہوا خالصتاً ایک لسانی علامت (Linguistic Label) میں تبدیل ہوا۔ حافظ محمود شیرانی کی اس وسیع اور مدلل تحقیق نے اردو کے نام कण (نام رکھے جانے کے عمل) کو ایک سائنسی اور تاریخی جواز فراہم کیا، جس کے بعد اس زبان کا یہ نام علمی دنیا میں غیر متنازع اور مستقل طور پر رائج ہو گیا۔ ان کے مطابق:

”یہ لفظ اصل ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے یعنی اوردا، اورده، ارده، اردا اور اردو جس کے معنی فرود گاہ، لشکر اور پڑاؤ نیز لشکر و حصہ لشکر ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال خمیمہ، بازار، لشکر، حرم گاہ، محل و محل سرانے شاہی و قلعے پر بھی ہوتا ہے۔“ (10)

برصغیر پاک و ہند کی لسانی اور عسکری تاریخ میں لفظ 'اردو' کے اولین تشکیلی مراحل کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر سب سے پہلے اس لفظ کا تحریری استعمال مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر نے اپنی مشہور زمانہ خودنوشت 'توڑک باہری' (جو بنیادی طور پر چغتائی ترکی زبان میں تھی) میں کیا ہے۔ تاہم، یہاں یہ امر اکتوجہ ہے کہ بابر کے ہاں یہ لفظ زبان کے معنوں میں نہیں، بلکہ اپنے اصل ترکی مفہوم یعنی شاہی لشکر، 'کیپ' یا 'مرکز سلطنت' کے لیے استعمال تھا۔ اس نظریے کو دستاویزی شواہد سے مستحکم کرنے میں مایہ ناز محقق حافظ محمود شیرانی نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ شیرانی صاحب کی گراں قدر تحقیق کے مطابق، شہنشاہ بابر کے عہد میں یہ لفظ اس قدر وسعت اختیار کر چکا تھا کہ وہ محض لشکر ہی نہیں، بلکہ اپنی سرکاری نلسال (جہاں شاہی سکے ڈھالے جاتے تھے) کو بھی 'اردو' کے نام سے ملقب کرتا تھا۔ سکوں پر "ضرب اردو" (اردو میں ڈھالا گیا) کا کندہ ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ 'اردو' سے مراد وہ متحرک شاہی مرکز تھا جہاں بادشاہ کا قیام ہوتا تھا۔ عہد اکبری تک آتے آتے اس عسکری اور انتظامی اصطلاح نے مزید تنوع اور شان و شوکت اختیار کر لی۔ جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں شاہی لشکر کی نلسال کو باقاعدہ طور پر 'اردو ظفر قرین' یا 'اردوئے ظفر قرین' (فتح کی نشانی والا لشکر / مرکز) کا سرکاری نام دیا گیا، اور بعض دستاویزی و تحریری مواقع پر اختصار کے پیش نظر اسے خال خال صرف 'اردو' بھی لکھا اور پکارا جاتا رہا۔ جہاں تک شاہی لشکر یا دارالخلافہ کے لیے مخصوص اصطلاح 'اردوئے معلیٰ' (عظیم الشان لشکر / کیپ) کا تعلق ہے، تو حافظ محمود شیرانی کی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ ترکیب بھی اکبر کے عہد میں پوری طرح مروج اور مقبول ہو چکی تھی، نہ کہ صرف شاہجہاں کے دور میں (جیسا کہ بعض روایتی تذکرہ نگاروں کا خیال تھا)۔

حافظ محمود شیرانی نے عہد اکبری اور اس کے مابعد کے تاریخی متون، فرامین اور تواریخ کا انتہائی باریک بینی سے مطالعہ کر کے اس لفظ سے وابستہ شاہی اور عسکری ترکیب کی ایک طویل فہرست گنوائی ہے، جو اس دور کی تہذیبی اور انتظامی ساخت کو واضح کرتی ہیں۔ ان ترکیب میں درج ذیل اصطلاحات شامل ہیں:

اردوئے معلیٰ اور اردوئے عالی (بلند مرتبہ یا شاہی کیپ)

اردو علیہا (محترم یا بلند پایہ مرکز)

اردوئے لشکر (سپاہ کا مرکز یا فوجی چھاؤنی)

اردوئے حضرت (حضور والا یا بادشاہ کا قیام گاہ)

اردو ظفرین (دوہری فتح کا حامل لشکر)

اردوئے بزرگ (عظیم الشان شاہی لشکر)

شیرانی صاحب کی اس مفصل اور مستند لغوی کھوج سے یہ علمی نقطہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ 'اردو' زبان کا نام بننے سے صدیوں پہلے، مغلیہ عہد کے سیاسی، عسکری اور انتظامی نظام کا ایک ناگزیر حصہ بن چکا تھا، اور یہی عظمت رفتہ رفتہ شاہی قلعے کے بازار سے وابستہ ہو کر اس مخلوط زبان کا مقدر بنی۔

لفظ 'اردو' اپنی مختلف صورتوں میں رائج تو تھا، مگر ابھی تک یہ زبان کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ جہاں گہر کے وقت تک اس زبان کا نام 'ہندوی' یا 'ہندی' ہی رہا۔ جب شاہجہاں نے دہلی میں نیا شہر آباد کیا تو اس نے اپنے شاہی شہر اور قلعے کے لیے 'اردوئے معلیٰ' کا نام تجویز کیا۔ اس سلسلے میں میرامن کا 'باغ و بہار' میں یہ بیان قابل غور ہے:



”تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دار الخلافت بنایا۔ تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلی جدی ہے، وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔“ (11)

اس وقت بھی شاعری کے لیے ریختہ کا استعمال ہی مروج تھا لیکن ’اردوئے معلیٰ‘ کی مخصوص اصطلاح وجود پا چکی تھی۔ میر تقی میر نے ’نکات الشعرا‘ (۱۷۵۲ء) اور قائم چاند پوری نے ’مخزن نکات‘ میں ’اردوئے معلیٰ‘ کو قلعے کے روزمرہ اور محاورے کے طور پر لکھا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

”ہمارے زبان کے نام کے طور پر لفظ ’اردو‘ کا استعمال اٹھارویں صدی کے رابع آخر کے پہلے نہیں ملتا۔ زبان کے نام کے طور پر اس لفظ (اردو) کی زندگی غالباً زبان اردوئے

معلیٰ شاہجہان آباد کی شکل میں شروع ہوئی اور اس سے مراد تھی، شاہجہان آباد کے شہر معلیٰ / قلعہ معلیٰ / دربار معلیٰ کی زبان۔“ (12)

اردوئے معلیٰ کی اصطلاح طویل ہونے کی وجہ سے عام نہ رہ سکی اور آہستہ آہستہ یہ فقرہ مختصر ہو کر صرف ’اردو‘ رہ گیا۔ ۱۷۸۰ء کے آس پاس زبان کے لیے مستقل طور پر لفظ ’اردو‘ کا استعمال ہونے لگا۔ تذکرہ ’گلزار ابراہیم‘ (۱۷۸۳ء) اور ’صحفی‘ کے ’تذکرہ ہندی‘ (۱۷۹۳ء) میں زبان کے لیے لفظ ’اردو‘ ملتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق، مغربی مصنفین میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ پہلے شخص ہیں جو اپنی انگریزی تالیف ’قواعد زبان ہندوستان‘ (۱۷۹۶ء) میں اس زبان کے لیے ’اردو‘ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اردو زبان کے نام اور اس کے ماخذ کے حوالے سے لسانیاتی حلقوں میں جہاں محققین کی غالب اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ’اردو‘ ترکی الاصل (Of Turkish Origin) لفظ ہے اور اس کے معنی لشکر یا چھاؤنی کے ہیں، وہاں بیسویں صدی کے ممتاز مفکر، ماہر لسانیات اور جلیل القدر عالم علامہ آئی آئی قاضی (امداد علی امام علی قاضی) نے اپنی متبادل اور جدید لسانی تحقیقات کی بنا پر اس روایتی نظریے سے شدید اختلاف کیا ہے اور لفظ ’اردو‘ کو ترکی زبان کا لفظ تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ علامہ آئی آئی قاضی کا یہ علمی موقف روایتی تذکرہ نگاروں کے برخلاف، محض ایک مفروضہ نہیں بلکہ تقابلی لسانیات (Comparative Linguistics) کے گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے۔

علامہ آئی آئی قاضی کے نزدیک، کسی لفظ کی صرف ظاہری مماثلت یا تاریخی لشکری ملاپ کو دیکھ کر اس کا شجرہ نسب طے کر دینا سائنسی طریقہ کار نہیں ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ لفظ ’اردو‘ کے لسانی ماخذ دراصل ہند-یورپی (Indo-European) یا قدیم آریائی زبانوں کے جڑا دوں (Root Words) میں تلاش کیے جانے چاہئیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق، یہ لفظ قدیم سنسکرت یا ہند-آریائی زبان کے لفظ ’اردوہ‘ (Urva) یا اس سے ملتی جلتی صوتیاتی جڑوں سے مشتق ہو سکتا ہے، جس کے معنی ’مقدس‘ یا ’مرکزی جگہ‘ کے ہیں، نہ کہ کسی وحشی یا خانہ بدوش لشکر کے۔

ان کا یہ بھی استدلال تھا کہ مغلیہ سلطنت میں چغتائی ترکی اگرچہ شاہی خاندان کی مادری زبان تھی، لیکن وہاں کی دفتری، علمی اور درباری زبان فارسی تھی، اور عوامی رابطے کی زبان مقامی بولیاں تھیں۔ ایسے میں ایک پوری زبان کا نام کسی ایسے خالص ترکی لفظ پر مستقل ہو جانا۔ جس کا مقامی نثری اور شعری مزاج سے کوئی صوتیاتی یا فکری جوڑ نہ ہو۔ لسانی اصولوں کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ، علامہ آئی آئی قاضی نے اس نظریے کو رد کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ’اردو‘ کا لفظ اپنے ارتقا اور صوتی ساخت کے اعتبار سے اس دھرتی کے اپنے لسانی مزاج اور قدیم ہند-آریائی پس منظر سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ وہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

”عام سندھی بول چال میں ’اردو‘ ڈھیر یا اشیاء کے ذخیروں اور انسانوں کے اجتماع کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے یہ معنی عربوں کے سندھ میں وارد ہونے سے تین ہزار برس پہلے سے رائج ہیں، تاہم لفظ ارد (urd) -سندھ یا ہند میں پیدا نہیں ہوا۔۔۔ قدیم ناردک (Nordic) دیومالا میں لفظ ’ارد‘ (urd) یا ’اُرتھ‘ (urth) ایک دیوی کا نام ہے جو خود تقدیر ہے۔۔۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ ’ارد‘ آریا زبان کے قدیم ترین لفظوں میں سے ہے اور آج تک زندہ چلا آتا ہے۔ یہی وہ لفظ ہے جو لفظ ’اردو‘ کا ماخذ ہے جس کے معنی ایسے مجمع کی زبان کے ہیں کہ جس میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوں۔“ (13)

اس ضمن میں ایک اور لفظ نظر یہ بھی ہے کہ اردو کا لفظ دراصل لاطینی الاصل ہے جو HORDE سے بنا ہے، جس کے معنی گروہ، مجمع، لشکر اور بعض اوقات خانہ بدوش کے ہوتے ہیں۔ ترکی میں یہ لفظ بعد میں پہنچا۔ حکیم شمس اللہ قادری اپنی تالیف ’اردوئے قدیم‘ میں لکھتے ہیں:

”چنگیز خان اور اس کی اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور بادشاہ زادوں کے فرود گاہوں اور لشکر گاہوں کو ’اردو‘ کہا کرتے تھے یہاں تک کہ ان کا مستقر حکومت بھی اردو کہلاتا تھا اور ’قرم‘ کا قدیم نام ’اردو‘ یا ’لیغ‘ تھا۔ چنگیز خان کے فرزند جو جی خان کی اولاد نے دشت قپچاق اور روس و بلغاریہ میں ایک وسیع حکومت قائم کر لی تھی۔ وہ جب کسی مہم پر



مستقر سے رواں ہوتے تو زریں خیموں میں قیام کرتے تھے جس کے باعث ان کی لشکر گاہیں اردوئے طلا (Golden Horde) کہلاتی تھیں... ہندوستان میں لفظ اردو کا استعمال
سلاطین دہلی کے عہد سے شروع ہوا اور یہاں بھی لشکر گاہ کو اردو کہنے لگے۔“ (14)

اردو کے ناموں کے سلسلے میں پیشتر محققین نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ مختلف صوبوں اور علاقوں کی مناسبت سے یہ زبان دکنی، گجری اور پنجابی وغیرہ بھی کہلاتی رہی۔ جیسا
کہ شیخ بہاؤ الدین باجن نے اپنے کلام کی زبان کو زبان دہلوی کہا تھا۔ بقول مولوی عبدالحق:

”یہ زبان (یعنی اردو) دکن میں آئی اور اس میں دکنی الفاظ اور لہجہ داخل ہوا تو دکنی کہلاتی اور گجرات میں پہنچی تو اس خصوصیت کی وجہ سے گجری اور گجراتی کہی جانے لگی۔“ (15)
اسی طرح ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی اردو کے دہلوی، گجری یا گوجری اور دکنی نام گنوانے کے بعد اپنی کتاب ’اردو زبان کا ارتقا‘ میں لکھتے ہیں کہ یہ نام اردو کو ان مقامات کے تعلق
سے دیے گئے جہاں اول اول اردو کو فروغ ہوا۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہماری پیاری زبان ’اردو‘ یکا یک اس نام سے دنیا کے سامنے نہیں آئی، بلکہ یہ صدیوں کے لسانی، تہذیبی اور جغرافیائی سفر کے دوران مختلف ناموں کے روپ
دھارتی ہوئی بالاخر اپنے موجودہ نام اور تشخص تک پہنچی ہے۔ اردو زبان کا ہندوی سے اردو تک کا ارتقائی سفر برصغیر کی تاریخ کا ایک ایسا انوکھا اور سحر انگیز باب ہے جس کی مثال
دنیا کی دیگر زبانوں میں کم ہی ملتی ہے؛ کیونکہ یہ زبان کسی ایک قوم، طبقے یا بادشاہ کی مرضی سے نہیں، بلکہ صدیوں پر محیط لشکری، عوامی، صوفیانہ اور درباری مراحل سے گزر کر
اپنے موجودہ روپ میں سامنے آئی ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں یہ زبان مختلف نسلوں کے لشکری کیمپوں اور بازاروں میں ایک عارضی رابطے کے طور پر ابھری، پھر صوفیانے کرام
کی خانقاہوں اور درویشوں کے اخلاص کی بدولت اس نے عوام کے دلوں میں گھر کیا، اور آخر کار اپنی بے پناہ مقبولیت اور نکھار کے باعث شاہی درباروں کی زینت بن کر ایک
مقتدر ادبی زبان کے مرتبے پر فائز ہوئی۔ اس پورے طویل تاریخی سفر میں اردو کی سب سے بڑی طاقت اس کی بے مثال پلک، جذب کرنے کی صلاحیت (Assimilation)
اور بے پناہ وسعت قلبی رہی ہے، جس نے ہر دور کے سیاسی و جغرافیائی حالات کے مطابق ہندوی، دہلوی، گجری، دکنی اور ریختہ جیسے متنوع ناموں اور مختلف زبانوں کے لسانی
اثرات کو خوش دلی سے اپنے اندر سمویا، مگر اس سب کے باوجود اپنی بنیادی انفرادیت، مٹھاس، مخصوص مزاج اور تہذیبی تشخص پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ یہی وجہ ہے کہ آج
اردو محض ایک زبان کا نام نہیں، بلکہ برصغیر کی اس گنگا جمنی تہذیب، رواداری اور مشترکہ ورثے کا نچوڑ ہے جو اپنے اندر ماضی کی تاریخ کو سمیٹے ہوئے، حال کے تقاضوں کو پورا
کرتی ہے اور مستقبل میں بھی نئے لسانی و علمی چیلنجز کا سامنا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

حوالہ جات:

- ۱۔ داغ دہلوی، کلیات داغ (گلزار داغ)، نئی دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۸ء، ص ۳۴۵
- ۲۔ شمس الرحمن فاروقی، اردو ادب کا ابتدائی زمانہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۲
- ۳۔ میر اثر، خواب و خیال (مرتبہ: مولوی عبدالحق)، پاکستان: انجمن ترقی اردو، بار دوم، ۱۹۵۰ء، ص ۱۱
- ۴۔ محمد حسین آزاد، آب حیات، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، چھٹا ایڈیشن، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰
- ۵۔ غلام ہدائی مصحفی، کلیات مصحفی (دیوان اول) (مرتبہ: نثار احمد فاروقی)، دہلی: مطبع کوہ نور پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۵
- ۶۔ مرزا اسد اللہ خان غالب، دیوان غالب (مرتبہ: نالک رام)، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ box، طبع دہم، ۱۹۹۵ء، ص ۸۷
- ۷۔ میر تقی میر، تذکرہ نکات الشعرا (مترجمہ: حمیدہ خاتون)، دہلی: جے کے آفسیٹ پرنٹرز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۸
- ۸۔ ولی دکنی، کلیات ولی (مرتبہ: نور الحسن ہاشمی)، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۳
- ۹۔ شمس الرحمن فاروقی، اردو ادب کا ابتدائی زمانہ، ص ۱۳
- ۱۰۔ حافظ محمود شیرانی، مقالات شیرانی (جلد اول) (مرتبہ: مظہر محمود شیرانی)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۱۱
- ۱۱۔ میر امن دہلوی، باغ و بہار (مرتبہ: رشید حسن خان)، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء، ص ۱۴



- ۱۲۔ شمس الرحمن فاروقی، اردو ادب کا ابتدائی زمانہ، ص ۱۶
- ۱۳۔ علامہ آئی آئی قاضی، "مقالہ مطبوعہ سویرا" (خاص شماره، ۱۹۷۹ء)، بحوالہ سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۵ء، ص ۵۸-۵۷
- ۱۴۔ حکیم شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، کراچی: جنرل پبلشنگ ہاؤس، طبع دوم، ۱۹۶۳ء، ص ۲۱-۲۰
- ۱۵۔ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، کراچی: انجمن ترقی اردو، طبع سوم، ۱۹۵۳ء

ماخذ و مصادر:

- آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی، چھٹا ایڈیشن، ۲۰۰۳ء۔
- اثر، میر، خواب و خیال (مرتبہ: عبدالحق)، پاکستان: انجمن ترقی اردو، بار دوم، ۱۹۵۰ء۔
- اکتر، سلیم، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (بشمول ماخذ: آئی آئی قاضی)، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۵ء
- المنعم، میر امن دہلوی، باغ و بہار (مرتبہ: رشید حسن خان)، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء
- جالبی، جمیل، تاریخ ادب اردو (جلد اول)، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، طبع پنجم، ۲۰۰۰ء۔
- داغ دہلوی، کلیات داغ (گلزار داغ)، نئی دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۸ء
- دکنی، ولی، کلیات ولی (مرتبہ: نور الحسن ہاشمی)، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۸ء
- شیرانی، حافظ محمود، مقالات شیرانی (جلد اول) (مرتبہ: مظہر محمود شیرانی)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء
- عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، کراچی: انجمن ترقی اردو، طبع سوم، ۱۹۵۳
- فاروقی، شمس الرحمن، اردو ادب کا ابتدائی زمانہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء
- قادری، حکیم شمس اللہ، اردوئے قدیم، کراچی: جنرل پبلشنگ ہاؤس، طبع دوم، ۱۹۶۳ء
- مصحفی، غلام ہمدانی، کلیات مصحفی (دیوان اول) (مرتبہ: نثار احمد فاروقی)، دہلی: مطبع کوہ نور پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۸ء
- میر، میر تقی، تذکرہ نکات الشعر (مترجمہ: حمیدہ خاتون)، دہلی: جے کے آفسیٹ پرنٹرز، ۱۹۹۳